ثقافت لاہور

محمد حنیف ندوی

قرآن میں رمز و اشارہ کی چند مثالیں

(۲)

(سلسلہ کے لئے دیکھئے ثقافت فروری ۱۹۶۲ء)

زیادہ تفصیلات میں جانے سے پہلے ہمیں مسئلہ کے اس پہلو کا جائزہ بھی لے لینا چاہیئے کہ رمز و اشارہ کی وسعتیں کہاں تک بڑھیں گی اور مجاز و استعارہ کے اطلاق میں کن کن حدود سے تجاوز کیا جائیگا؟ سوال کی یہ نوعیت اس بنا پر اہم ہے کہ تجاوز حدود سے بعض خطرناک بحثیں چھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انداز بیاں میں رمز و استعارہ کا یہ چلن صرف صفات ہی تک محدود کیوں تسلیم کیا جائے اور اس سے آگے بڑھکر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ لفظ اللہ اور رب کا اطلاق بھی مجازی ہے اور اس سے مراد کوئی فوق الادراک شخص یا ذات نہیں بلکہ صرف ایک قدر (VALUE) ہے۔

ہمارا یہ اندیشہ فرضی نہیں آج مغرب میں ایسے مفکرین کی کمی نہیں جو اللہ تعالیٰ کو مذہبی تصور سے الگ کرکے محض ایک مطمح نظر، صرف ایک نصب العین اور تنہا ایک مثالی قدر ہی سمجھتے ہیں، شخص، ذات یا الٰہ نہیں۔ ان کی رائے میں قدیم دور کا انسان چونکہ اقدار مجردہ کے ادراک سے قاصر اور عاری تھا اسلئے مذہب نے آسانی فہم کے پیش نظر کائنات کی اعلیٰ اور لائق پیروی قدروں کو ایک ذات میں مرتکز کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب جب علیم، حکیم، قادر اور رب رحمٰن خدا کا نام لیتا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ فہم و فکر کے حدود سے بالا کسی ہستی کو متوانا چاہتا ہے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ علم و حکمت اور قدرت و رحمت ایسی عمدہ صفات کی ٹھیک ٹھیک اہمیت محسوس کرنے لگیں۔

فلسفۂ مذہب کے اس جدید ترین رجحان کی بنا پر ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے مجازات کے دائرۂ اطلاق کی تعیین کر دیں اور بتا دیں کہ ان کی وسعتیں کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور کون کون مسائل خصوصیت سے اس کی زد میں آتے ہیں۔

ہمیں سب سے پہلے اس حقیقت کی پردہ کشائی کرنا ہے کہ مذہب اور فلسفہ میں فی ذاتی طور پر کوئی تضاد پایا نہیں جاتا ہاں ان کے تقاضے البتہ مختلف ہیں مثلاً مذہب اگر ایک خاص طرح کا تعین چاہتا ہے اور خاص نوع کے یقین کا طالب ہے تو فلسفہ یقین سے زیادہ وضاحت کا خواہاں ہے اسی طرح بجائے یقین کے اس کی دلچسپیاں زیادہ تر شک و ریب سے وابستہ ہیں۔ ایسے شک و ریب سے جو یقین و آگہی کی پہلی منزل ہے یا جس کو انکشاف و بصیرت کے دروازے پر پہلی دستک سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کی اپنی کوئی منزل نہیں اپنے کوئی معتقدات اور یقینیات نہیں۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو ان کی اصلی شکل میں پیش کرے اور یہ بتائے کہ غور و فکر اور استدلال میں کہیں خامی یا خلل تو رونما نہیں کہیں اجمال اور ابہام تو نہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا کام عقاید و ایمانیات کی نشاندہی کرنا نہیں بلکہ عقاید و نفسیات کی زلف پریشاں کو سنوارنا اور سلجھانا ہے۔

اس تجزیہ کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں یقینیات و ایمانیات کی فہرست تو بہرحال مذہب کی مدد سے مرتب کرنا ہوگی۔ اور فلسفہ و دانش کی خدمات سے صرف اسی حد تک استفادہ کرنا ہوگا۔ کہ جس سے ایمانیات کا چہرہ زیبا اور چمک اٹھے۔ اور اس کے رنگ روپ میں اور جلا پیدا ہو جائے۔ اس سے اعتقاد کی نفی اور یقین کی مخالفت کا کام لینا قطعی طور سے اس کے ناجائز استعمال کے مترادف ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کو ہم اس لئے نہیں مانتے کہ فلسفہ و دانش کے تقاضے ہمیں مجبور کرتے ہیں بلکہ اس لئے مانتے ہیں کہ ہماری نفسی اور عملی زندگی کا یہ ایک ناگزیر مطالبہ ہے اور ایسا ناگزیر ہے کہ جس کے بغیر ہمارا قلب ایک طرح کا خلا اور ویرانی سی محسوس کرتا ہے اور ہماری زندگی کی تفصیلات تشنہ اور نامکمل سی رہتی ہیں

مزید برآں تمام سامی مذاہب میں بالعموم اور قرآن میں بالخصوص اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کو اسقدر مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ نفی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسکی توجیہہ کے سلسلہ میں ہم یہ کہیں گے کہ بائیبل اور قرآن میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پر جو بظاہر جسمانیت کی چھاپ معلوم ہوتی ہے۔ تو اس بنا پر کہ اسکا الیقو تحقق و اثبات کے ایسے درجے پر فائز نظر آتا ہے کہ جہاں نفی ذات کے احتمالات کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔

فلسفۂ جدیدہ کے اس رجحان کو ہم بہرحال سراہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ایک تخلیقی اناہی نہ سمجھا

جاتے، بلکہ ایسی قدر قرار دیا جائے کہ جو انسان کے فکر و کردار کو چمکا دے۔ اس میں اعلیٰ تقاضوں کو بیدار کر سکے۔ اس کی سطح بشریت کو کنگرۂ ملکوت تک اچھال سکے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات نصب العین نہیں ہوتی منزل قرار نہیں پاتی اور حسن و زیبائی کا ایسا سرچشمہ نہیں ٹھہرتی کہ جس سے انسان اپنے فکر و عمل کے گیسوئے تابدار کو مزید آرائش و نمو بخش سکے تو اس سے اس کی ذاتی طور پر دلچسپی ختم ہو جاتی ہے چنانچہ مذہبی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ کا مسئلہ صرف ایک خالق و صانع کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق انسان کی براہ راست اصلاح سے ہے۔ اس کی تسکین قلب و روح سے ہے اور ایک ایسے اصول سے ہے کہ جو تقدم و ارتقاء کے جملہ دواعی کو زندگی و قوت عطا کرنے والا ہے

فلسفہ کو اس بنا پر بھی عقائد کے باب میں حکم۔ اور مستقل بالذات کسوٹی نہیں مانا جا سکتا کہ خود اس کی زیست و قوام میں مذہب کا دخل ہے۔ اس کے خمیر، اٹھان اور اس کی ترقی اور نشو و نما کے تمام مرحلوں میں ان افکار و تصورات کی منت پذیریوں کا خاصا حصہ ہے کہ جن کو پہلے پہل مذہب نے ایمانیات کی شکل میں پیش کیا۔

ہم جانتے ہیں کہ کچھ لوگوں کے نزدیک تاریخی لحاظ سے مذہب کی اولیت مسلم نہیں اور فلسفہ کے اس پہلو پر اختلاف رائے کے حدود بہت وسیع ہیں تاہم بحیثیت مسلمان کے ہم یہی سمجھتے ہیں اور بجا سمجھتے ہیں کہ فلسفہ یا زندگی کی کا کوئی متعین نقطہ نظر کسی مذہب کو جنم نہیں دیتا، بلکہ یہ فخر مذہب کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے آغوش میں فکر و دانش کے بہت سے گہرائے یکدانہ کی پرورش کی ہے۔

تاریخی حیثیت سے فلسفہ و عقلیت کے اس تاخر کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہم اس کی اہمیت کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ یا منطقی لحاظ سے اس کو جو شرف و فضیلت حاصل ہے ہم خدانخواستہ اس کو سرمو کم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کی افادیت اور نفع رسانیوں کے باوجود مذہب پر اس کی بالادستی کو تسلیم نہ کیا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کو مذہب و دین کے محتویات (CONTENTS) کے متعین کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ ہم عقاید و ایمانیت کی فہرست کو بہرحال قرآن سے اخذ کریں گے اور اس سے صرف اتنا بھر کام لیں گے۔ کہ ان عقاید کو سلجھانے کے لئے

ہمیں یہ تابش وضو عطا کرے، اور بس۔ اس سے زیادہ کی اس سے توقع رکھنا عبث ہے۔

صفات کے علاوہ رمز و استعارہ کی کارفرمائیوں کی اصل جولانگاہ یا ہدف جو مسائل ہو سکتے ہیں وہ ہمارے نزدیک یہ ہیں۔

(۱) آفرینش کائنات،

(۲) قصۂ آدم و حوا،

(۳) جنات و ملائکہ،

(۴) شیطان،

(۵) جنت و دوزخ،

(۶) قصص۔

آیئے علی الترتیب ان عنوانوں پر غور کریں اور دیکھیں کہ فہم و تعبیر کے اس انداز سے ان کے سمجھنے میں کس حد تک مدد ملتی ہے۔

آفرینش کائنات کے بارہ میں قرآن میں جابجا تصریحات ملتی ہیں۔

انّ ربّکم اللّٰہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستّۃ ایّام ثمّ استوٰی علی العرش یغشی الّیل النّھار یطلبہ حثیثًا والشمس والقمر والنجوم مسخّرٰت بامرہٖ الا لہ الخلق والامر تبٰرک اللّٰہ ربّ العالمین[۱]۔

کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پہ جا ٹھہرا وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند اور ستاروں کو پیدا کیا اور سب اسی کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں دیکھو! سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔ یہ خدائے رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔

---

[۱] اعراف ۵۴

ان ربّکم الّذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استوٰی علی العرش یدبّر الامر ما من شفیع الا من بعد اذنہ ذٰلکم اللّٰہ ربّکم فاعبدوہ افلا تذکرون [1]

تمہارا پروردگار تو خدا ہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر تخت پر قائم ہوا وہی ہر ایک کام کا انتظام کرتا ہے کوئی اس کا اذن حاصل کئے بغیر کسی کی سفارش نہیں کر سکتا یہی خدا تمہارا پروردگار ہے اس کی عبادت کرو۔ بھلا تم غور کیوں نہیں کرتے

وھو الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام وکان عرشہ علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملاً [2]

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں بنایا اور اس کا عرش پانی پر تھا تمہارے پیدا کرنے سے مقصد یہ ہے کہ تم کو آزمائے کہ تم میں عمل کرنے کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔

ھو الّذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استوٰی علی العرش یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو معکم این ما کنتم واللّٰہ بما تعملون بصیر [3]

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا۔ اس کو سب معلوم ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے۔ جو آسمان سے اترتی ہے اور اس کی طرف چڑھتی ہے اور تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

الّذی خلق السمٰوٰت والارض وما بینھما فی ستۃ ایام ثم استوٰی علی العرش الرحمٰن فسئل بہ خبیرا [4]

جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا وہ رحمٰن ہے اس کا حال کسی باخبر سے دریافت کر لو۔

قل ائنکم لتکفرون بالّذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ اندادا ذٰلک ربّ العالمین وجعل فیھا رواسی من فوقھا

کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ اور بتوں کو اس کا مد مقابل بناتے ہو وہی تو سارے جہان کا مالک ہے اور اسی نے زمین میں

---

[1] یونس ۳ ، [2] ہود ۷ ، [3] الحدید ۴ ، [4] الفرقان ۵۹ ، [5]

وبارك فيها وقدر فيها اقواتها في اربعة ايام سواء للسائلين. ثم استوى الى السماء وهي دخان فقال لها وللارض ائتيا طوعا او كرها۔ قالتا اتينا طائعين۔ ۱

اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی۔ اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کیا اور یہ سب کام چار دن میں مکمل ہو گئے تمام طلبگاروں کے لئے یکساں، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ آؤ خواہ خوشی سے خواہ ناخوشی سے انہوں نے کہا ہم خوشی سے آگئے ہیں

(۲) ولقد خلقنا السموات والارض في ستة ايام وما مسنا من لغوب ٥ فاصبر على ما يقولون ۔ ۲

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو مخلوق ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنایا اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں ہوا تو جو کچھ یہ کہتے ہیں۔ اس پر صبر کرو۔

یہ کائنات رنگ و بو کیونکر بنی اور کس طرح اس نے تخلیق و ترقی کے جملہ مراحل طے کئے یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی جواب قطعیت کے ساتھ دینا ناممکن ہے قرآن ہی میں ہے۔

ما اشهدتهم خلق السموات والارض ولا خلق انفسهم۔ ۳

میں نے اس کو نہ تو آسمانوں اور زمین پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا۔ اور نہ خود اسکو پیدا کرنے کے وقت

تاہم اس حد تک طے ہے کہ اس عالم ارضی کو زندگی کی موجودہ گہما گہمیوں تک پہنچنے کے لئے لاکھوں برس کا انتظار کرنا پڑا ہے سوال یہ ہے کہ ارتقاء (EVOLUTION) کا یہ تصور اگر صحیح ہے تو پھر چھ ہی دنوں میں دنیا کا پیدا ہو جانا کس طرح صحیح قرار دیا جا سکتا ہے اور آیا کائنات کے بارہ میں اس نوع کی تعبیر کو حد سے بڑھی ہوئی سادہ تشریح (OVER SIMPLIFICATION) کے زمرہ میں تو شمار نہیں کیا جا سکتا؟

اس میں شبہ نہیں کہ مسئلہ ارتقاء نے اس دور میں ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے چنانچہ باوجود اس کے کہ اس کی تفصیلات میں اچھا خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس حقیقت میں بحث و تمحیص کی

---

۱ السجدة ۱۱ ۲ ق ۳۹ ۳ الکھف ۵۱

کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور یہ کارخانۂ حیات، ساکت و راکد (STATIC) بہرحال نہیں ہے اور اس کو ترقی و اتمام کی موجودہ منزلوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وقت و زماں کی لاکھوں اور کروڑوں کروٹوں کا رہین منت ہونا پڑا ہے۔

اس دور کے متکلمین اور مفسرین نے اس اشکال سے نکلنے کی یہ صورت اختیار کی ہے کہ قرآن حکیم میں "ستۃ ایام" (چھ دن) کا جو لفظ آیا ہے اس سے مراد نظام شمسی کے مصطلح چھ دن نہیں بلکہ لفظ یوم تخلیق و تعمیر کے ایک طویل عرصہ سے عبارت ہے۔ جس کی وسعت سیکڑوں اور ہزاروں برسوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوتے ہے چنانچہ قرآن ہی میں ہے۔

فی یوم کان مقدارہٗ الف سنۃ مما تعدون[1]	ایک دن جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ہزار برس ہوگی
تعرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہٗ خمسین الف سنۃ[2]	جس کی طرف روح الامین اور فرشتے صعود کرتے ہیں اس روز نازل ہوگا جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔

کیا اس سے ان شبہات کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے کہ جن کو نظریہ ارتقاء نے جنم دیا ہے۔ ہماری رائے میں تفسیر و تاویل کا یہ انداز سراسر مناظرانہ ہے اور اس سے ان شکوک کا قلع قمع نہیں ہو پاتا کہ جن کو ارضیات حیاتیات اور کائنات کی اصل و تخلیق کے بارے میں مختلف علوم و فنون نے پیدا کیا ہے یعنی اس سے دفع الوقتی کا کام تو لیا جا سکتا ہے مگر اس کو علمی سطح پر تسلی بخش طریق استدلال ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس لئے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ لفظ یوم کا اطلاق ہمیشہ نظام شمسی کی مقررہ کروٹوں ہی پر نہیں ہوتا بلکہ ایک طویل عرصہ یا مہلت پر بھی ہوتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان ایات میں بھی یوم کا لفظ انہیں مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یہ امر بحث طلب ہے کیونکہ اس سے پہلے مثبت انداز میں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ قرآن میں کائنات کی تخلیق و ابداع کے سلسلہ میں نظریہ ارتقاء کے اصول و مبادی کو تسلیم کیا گیا ہے ورنہ اس طرز استدلال کو منطقی کی اصطلاح میں صریحی مصادرہ (PETITIO PRINCIPII) ٹھہرایا جائیگا۔

---

[1] السجدہ ۵ ، [2] المعارج ۴

مزید برآں اس سے پہلے یہ بھی ثابت کرنا ہوگا۔ کہ قرآن حکیم کے دائرہ فوائض میں جہاں یہ بات داخل ہے کہ وہ عقاید کی گتھیاں سلجھائے، عبادات کی تشریح کرے اور اخلاق و معاشرت کے پیمانے مقرر کرے۔ وہاں اس کے پہلو بہ پہلو اس کی دعوت کا ایک ضروری حصہ یہ بھی ہے کہ سائنسی حقائق کی پردہ کشائی کرے اور یہ بھی بتائے کہ زمین و آسمان کی تخلیق و ابداع میں کیا طبعی اصول کارفرما ہیں۔

ظاہر ہے ایسا ماننا محض ایک طرح کا تکلف ہوگا جس کا نہ تو قرآن کا انداز بیان ہی متحمل ہو سکتا ہے اور نہ اس سے اس ذہن کی تسکین ہی ممکن ہے جو مسائل کو اپنی اصلی اور فطری شکل میں دیکھنے کا عادی ہے۔

پھر قرآن کو سائنس کے مطابق ثابت کرنے کا یہ خطرناک رجحان آخر میں جس تشکیک کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا حال ان لوگوں سے پوچھئے جنہوں نے بائیبل کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے کہ اس کے معانی میں سائنس کے اکتشافات سے مرعوبیت کی بنا پر کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور کس طرح مغرب کے فضلاء مجبور ہوئے ہیں کہ اس کو وحی و الہام قرار دینے کی بجائے محض عبرانی عقاید و تصورات کی ایک تاریخی دستاویز ہی سمجھنے پر اکتفا کریں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مفتی عبدہٗ۔ طنطاوی اور ابوالکلام آزاد نے نظریہ ارتقاء کو قرآن سے مستنبط کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کی رنگینیٔ بیان نے تو اسے بڑی ہی دلنشیں صورت میں پیش کیا ہے مگر ہمیں اصرار ہے کہ ان لوگوں کی ان کاوشوں کے باوجود اس طرز استدلال کو علمی اور مخلصانہ طرز استدلال نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل تین نکات کی روشنی میں ہمارے اس اصرار کی معقولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) قرآن کا اصلی و بنیادی موضوع۔ انسان کی نفسی و اخلاقی حالت کی اصلاح ہے سائنسی علوم و حقائق کی وضاحت نہیں۔

(۲) قرآن کا انداز بیان اس انداز بیان سے قطعی مختلف ہے جو سائنسی حقائق کو بیان کرنے کے لئے عموماً اختیار کیا جاتا ہے۔

(۳) سائنسی حقائق کے مطابق تفسیر قرآن کا رجحان، خطرناک تشکیک پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔

ان نکات کی ایک ایک شق تفصیلات چاہتی ہے مگر ہم بہ نظر اختصار ان سب سے قطع نظر کرتے ہیں اور پہلی ہی فرصت میں بتانا چاہتے ہیں کہ ان آیات کی صحیح صحیح اور سمجھ میں آنے والی تفسیر کیا ہے۔ مگر اس سے قبل اس غلط فہمی کو دور کر دینا بہت ضروری ہے۔ کہ خدانخواستہ ہم قرآن حکیم میں سرے سے کسی علمی انکشاف کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ حاشا وکلا، ہمارا منشا ہرگز یہ نہیں اور یہ ممکن بھی کیسے ہے کہ ایک کتاب علام الغیوب خدا کی طرف سے نازل ہو اور اس میں علم و آگاہی کے خوارق یا معجزات نہ پائے جائیں بلاشبہ اس میں حقائق کا ایک لازوال دریا موجزن ہے۔

ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اشارات و تلمیحات کی حد تک اس اصول کو ماننا اور بات ہے اور یہ کہنا کہ قرآن نے کسی سائنسی تصور کو واضح علمی شکل میں بیان کیا ہے یہ دوسری چیز ہے اور ہمارا اختلاف اسی دوسری حقیقت سے متعلق ہے۔ ہماری رائے میں قرآنی آیات کی تفسیر ایسے سہل اور قدرتی اور سمجھ میں آنے والے انداز میں ہونا چاہیے کہ جس میں استدلال و استنباط کی کھینچا تانی نہ ہو اور جو صرف لغت و ادب کی کسوٹیوں ہی پر پوری نہ اترے، بلکہ تاریخی طور پر بھی اس کی حقانیت کو ثابت کیا جا سکے یہی نہیں تاریخ کے ہر ہر دور میں جس کی صداقت غیر متاثر اور غیر متبدل رہے۔

ان آیات کی اصل اور صحیح توجیہہ یہ ہے کہ قرآن حکیم جس دور میں نازل ہوا ہے اس میں کائنات کے بارہ میں کچھ اصول پہلے سے مسلمہ چلے آرہے تھے۔ مثلاً یہ کہ ارضی مرکزی (GEOCENTRIC) ہے اور آفتاب اس کے گرد اگرد گھومتا اور طلوع و غروب کے مناظر پیدا کرتا ہے۔ یہ کہ یہ زمین چپٹی ہے گول یا بیضوی نہیں اور یہ کہ یہ سقف زنگار جو ہمارے سروں پر سایہ آفگن ہے ایک ٹھوس اور شفاف قُبّہ سے تعبیر ہے اسی طرح اس دنیا کے رنگ و بو کی پیدائش و تخلیق سے متعلق مشہور تھا کہ یہ پورے چھ دنوں میں تکمیل تک پہنچی ہے۔ یہ مؤخر الذکر عقیدہ جیسا کہ ہم آئندہ چلکر بتائیں گے۔ براہ راست یہودیوں کے ان تاثرات سے ماخوذ ہے۔ جن کا تعلق ان کے مخصوص علم الکائنات (COSMOLOGY) سے ہے قرآن حکیم کے انداز بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اس دور کے مزعومات کی تردید نہیں کرتا بلکہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں درس اخلاق (MORAL) کی کتنی بڑی مقدار پوشیدہ ہے۔ یعنی

قرآن ان نیم علمی مسلمات میں ایسا رنگ بھرتا ہے کہ جس سے ذہن توحید کے بلند پایہ معارف کی طرف بے اختیار منتقل ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان رنگیں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحتیں اور مہربانیاں کارفرما ہیں۔ گویا قرآن کا موقف ان مسائل کے بارے میں یہ ہے کہ ان کو حقائق علمیہ کے بجائے ایک طرح کا پیرایہ بیان قرار دیا جائے جس سے کہ کچھ اعلیٰ مقاصد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک لفظی اطلاقات سے قطع نظر اصل اہمیت، درس و اخلاق کو حاصل ہے اس کی بین مثال حضرت ابراہیم کی اس دلیل میں ہے جس کی محکمی و استواری کو اللہ تعالیٰ اعطاء حجت کے پر فخار لفظ سے تعبیر فرماتا ہے۔

دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی قوم کے عقیدہ ستارہ پرستی کو علم و تحقیق کی کسوٹیوں پر پرکھنا شروع کرتے ہیں۔ کواکب و نجوم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھ کر منہ موڑ لیتے ہیں کہ باایں ضوء گستری و تابندگی ان کے لئے بھی " افول و غروب" کا ایک عیب مقدر رہے۔

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ[۱] — مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔

چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی تھوڑی دیر کے لئے قلب و ذہن کو متاثر کرتی ہے مگر،

فلما افل قال لئن لم یہدنی ربی لاکونن من القوم الضالین[۲] — جب وہ بھی چھپ گیا تو بول اٹھے کہ اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا راستہ نہیں دکھائیگا تو میں ان لوگوں میں ہو جاؤں گا۔ جو بھٹک رہے ہیں۔

اس کے بعد نظریں آفتاب عالمتاب پر ٹکتی ہیں اور زبان پر بے اختیار یہ الفاظ جاری ہو جاتے

هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ[۳] — میرا پروردگار یہ ہے یہ سب سے بڑا ہے۔

لیکن یہ کیفیت بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ غروب آفتاب کا بکلیا یہ منظر آنکھیں کھول دیتا ہے اور حضرت ابراہیم پکار اٹھتے ہیں۔

اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ — لوگو تم جن چیزوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو بیزار ہوں۔ میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے تئیں اسی

---

[۱] انعام ۷۶ ۔ [۲] انعام ۷۷ ، [۳] انعام ۷۸ ،

حنیفاً وما انا من المشرکین ۞ ؎ ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمینوں

انعام (۷۹) کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

سورہ انعام میں اس مقام کو کھول کر دیکھئے قرآن نے کتنی دلآویزی اور طنطنہ سے اس دلیل کو پیش کیا ہے مگر جب انسانی علم چند صدیاں آگے چل کر یہ ثابت کر دے کہ ستارے چاند اور یہ مہر جہاں تاب کبھی غروب ہونے والے نہیں اور رات دن کی ان تبدیلیوں میں، دخل نجوم و کواکب کی گردش کو نہیں زمین کی گردش کو ہے۔ تو بظاہر اس دلیل اور برہان کی ساری استواری و پختگی آن کی آن میں ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

لیکن اگر قرآن حکیم سے آپ الفاظ و حروف کی پابندیوں کی توقع نہ رکھیں تو اس دلیل کی آن بان اور چمک دمک میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی بشرطیکہ آپ یہ سمجھیں کہ حضرت ابراہیم اس وقت کے مسلمات کی روشنی میں جس حقیقت کو دلوں میں دراصل اتارنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ نجوم و کواکب کی یہ بزم حسین جن تغیرات سے دوچار ہوتی ہے قطع نظر اس کے کہ وہ تغیرات حقیقی ہوں یا عارضی ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ضو و تابش اور تاثیر و فیض کی یہ تمام تر صلاحیتیں ان کی اپنی نہیں ہیں بلکہ اس خدائے بخشندہ کی عطا کردہ ہیں جس نے زمین و آسماں کی ان پہنائیوں کو پیدا کیا ہے۔

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد کہ قرآن حکیم پیرایہ بیان سے کہیں زیادہ اہمیت درس و اخلاق کو دیتا ہے ان آیات کی تشریح و تعبیر کچھ مشکل نہیں رہتی کہ جن میں تخلیق و آفرینش کے سلسلہ میں چھ دنوں کا ذکر ہے۔ وہ درس و اخلاق کیا ہیں جن کی طرف اس پیرایہ بیان میں اشارہ کرنا مقصود ہے ان کو جاننے کے لئے کسی دور از کار تاویل کی ضرورت نہیں۔ ہر ہر آیت میں ان سے متعلق پہلے سے دلالتیں موجود ہیں۔

مثلاً پہلی آیت میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ شمس و قمر اور کواکب نجوم کا یہ نظام خود بخود اور آپ سے آپ نہیں چل رہا ہے بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے زیر تسخیر ہے اسی نے ان کو پیدا کیا ہے اور اسی کے حکم و امر سے یہ اپنے اپنے طبعی فرائض کو ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب ؎ دیکھو سب مخلوق اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا

؎ ۔ انعام ۷۹،

العٰلمین[1] ہے یہ خدائے رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔

دوسری آیت میں توحید کے اس پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جب کائنات کو پیدا اس نے کیا ہے اور اسکے نظم و نسق کو اسی نے سنبھال رکھا ہے تو معبودانِ باطل کو کیا حق ہے کہ اپنے پرستاروں کی سفارش کریں۔؟

ما من شفیع الا من بعد اذنہ[2] کوئی اس کا اذن حاصل کئے بغیر اس کی سفارش نہیں کر سکتا۔

تیسری آیت اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے کہ انسانی تخلیق کا منشا کیا ہے۔

لیبلوکم ایکم احسن عملا[3] تمہارے پیدا کرنے سے مقصود یہ ہے کہ تم کو آزمائے کہ تم میں عمل کرنے کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔

چوتھی آیت اللہ تعالیٰ کے ہمہ گیر علم کا نقشہ کھینچتی ہے اور بتاتی ہے کہ تمہارے عمل کا ایک ایک گوشہ اس کی نگاہِ احتساب کے سامنے ہے۔

وھو معکم این ما کنتم واللہ بما تعملون بصیر[4] اور تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو۔ خداوند دیکھ رہا ہے۔

پانچویں آیت میں شرک کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ جس خدا نے زمین کو تمہارے پاؤں تلے بچھایا ہے جس نے پہاڑوں کو استواری بخشی اور جس نے تمہارے لئے رزق کا سامان مہیا کیا کیا تم اس کے لئے شریک ٹھہراؤ گے۔

وتجعلون لہ اندادا ذالک ربّ العالمین[5] اور تم جنوں کو اس کا مدمقابل بناتے ہو وہی تو سارے جہاں کا مالک ہے۔

چھٹی آیت میں اسفارِ خمسہ کے یہودی مرتبین کی گمراہی واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے چھ ہی دنوں میں زمین و آسمان کی تکمیل فرمائی ہے تاہم اسے تکان ہرگز نہیں ہوا۔

ومامسنا من لغوب[6] اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں ہوا۔

ان دروس و اخلاق کو دیکھئے یہ کس درجہ اہم کس درجہ صحیح اور مفید حقائق کو اپنے آغوش میں

---

[1] اعراف ۵۴، [2] یونس ۳، [3] ہود ۷، [4] حدید ۳، [5] السجدۃ ۱۲، [6] ق ۲۹،

لئے ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اپنے دور کے مشہورات و مسلمات سے کیسے کیسے دقائق کا استنباط کرتا ہے اور پیرایہ بیان کی ذرا ذرا سی تبدیلیوں سے کیسے کیسے گرانمایہ نکات کی طرف فکر و ذہن کی توجہات کو موڑتا ہے۔

یہ مجاز کی ایسی قسم ہے جس میں لفظ کے بجائے کچھ حقائق اور مسلمات کو بطور پیرایہ بیان کے اختیار کیا جاتا ہے اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے کچھ بلند تر اور فائق تر معانی کی طرف ذہن انسانی کو ملتفت کیا جا سکے۔

کیا قرآن حکیم اس باب میں منفرد ہے؟ اور تنہا اسی نے مجاز و اشارہ کی ان نوعیتوں سے تعرض کیا ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ قرآن سے پہلے کے تمام صحائف انبیاء کا یہ جانا بوجھا انداز ہے چنانچہ یہ لطیفہ جاننے کے لائق ہے کہ خود بائیبل میں تخلیق و آفرینش کے بارے میں چھ دنوں کا یہ تصور ان کا اپنا نہیں۔ بلکہ محققین کے نقطۂ نظر سے ان افکار و تصورات کا بعینہٖ چربہ ہے جو اس دور کی معاصر قوموں میں رائج تھے اور بابل نینویٰ کے عوام جن کی صحت و استواری پر محکم ایمان رکھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ بائیبل کے موجودہ شارحین نے تخلیق و آفرینش کے اس ابتدائی قصہ کو کسی علمی حقیقت (SCIENTIFIC TRUTH) کی حیثیت ——— سے قبول نہیں کیا بلکہ ان سے متعلق یہی جچا تلا موقف اختیار کیا ہے کہ ان کی حیثیت محض پیرایۂ بیان ہی کی سی ہے۔

(باقی آئندہ)

تفصیل کے لئے دیکھو کتاب پیدائش (GENESIS) باب ۱، ۲ دیکھئے۔ نیو کومنٹری آن ہولی سکرپچر میں۔ سی۔ ای۔ او جیمز کا مضمون ص ۹۸